باب۔ ۲۴

ترجمہ

فص ہارونیہ

حکمت امامیہ

واضح ہو کہ ہارون علیہ السلام کا وجود رحمتِ الٰہی سے تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وَوَهَبْنَا لَهُ مِن رَّحْمَتِنَا أَخَاهُ هَارُونَ نَبِيًّا، (یعنی) ہم نے {موسیٰؑ کے لیے} اپنی رحمت سے ان کے بھائی ہارون کو نبی بنا دیا، (مریم:۵۳)۔ لہٰذا ہارونؑ کی نبوت رحمتِ الٰہی سے تھی۔ ہارونؑ، موسیٰ علیہ السلام سے عمر میں زیادہ تھے اور موسیٰؑ، ہارونؑ سے نبوت میں بزرگ تر تھے۔ چوں کہ ہارونؑ کی نبوت رحمتِ الٰہی سے تھی لہٰذا انھوں نے اپنے بھائی موسیٰؑ کو کہا، يَا ابْنَ أُمَّ، (یعنی) میری ماں کے بیٹے، (طٰہٰ:۹۴)۔ انھوں نے ماں کی نسبت کا ذکر کیا نہ کہ باپ کی۔ اس لیے کہ ماں رحمت و شفقت میں باپ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر ماں میں محبت و شفقت زیادہ نہ ہوتی تو اولاد کی پرورش کی تکلیفات کو برداشت نہ کرتی۔ پھر ہارون علیہ السلام نے کہا، لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي، (یعنی) میری ڈاڑھی نہ پکڑو اور نہ میرا سر، (طٰہٰ:۹۴)۔ (اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ) فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ، (یعنی) یوں میرے دشمنوں کو میری اہانت سے خوش نہ کرو، (الاعراف:۱۵۰)۔ ہارونؑ کے یہ سب کلمات رحمت کے آثار سے اور اس کے جھونکوں میں سے جھونکے ہیں۔ موسیٰؑ کے غضب کا سبب غیرت و حمیّتِ حق ہے، اور الواح (یعنی دین کی کتابوں) میں غور و تأمل نہ کرنا ہے۔ اگر موسیٰؑ ان الواح میں غور و تأمل فرماتے تو ان میں ہدایت و رحمت پاتے۔ ہدایت کیا تھی۔۔؟ اُس امر حق کا بیان تھا، جس نے موسیٰ کو غضبناک بنا دیا تھا، اور ہارونؑ اس سے بَری تھے۔ ان الواح میں بھائی پر رحمت کرنے کا بھی ذکر تھا۔ پھر موسیٰؑ، ہارونؑ کی ڈاڑھی نہ پکڑتے، وہ بھی قوم کے سامنے، باوجود یہ کہ ہارونؑ، موسیٰؑ سے بڑے تھے، عمر میں زیادہ تھے۔ ہارونؑ کے یہ سب کام موسیٰؑ پر شفقت سے تھے۔ کیوں کہ ہارونؑ کی نبوت مقتضائے رحمتِ الٰہی سے تھی۔ پھر ہارونؑ سے اس کے سوا اور کیا ظاہر و صادر ہوتا۔

پھر ہارونؑ نے موسیٰؑ سے کہا، إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ، (یعنی) میں اس بات سے ڈرا کہ تم کہو، تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا، (طٰہٰ:۹۴)۔ اور تم مجھ کو ان کے تفرقے کا سبب ٹھیراؤ، حالاں کہ

گوسالہ پرستی (یعنی بچھڑے کی مورتی کی پوجا) نے ان میں تفرقہ پیدا کیا تھا نہ کہ میں نے۔ بنی اسرائیل میں بعض سامری کی اتباع و تقلید میں گوسالہ پرستی میں مبتلا تھے۔ اور ان میں سے بعض گوسالہ پرستی سے متوقف اور رکے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ موسیٰؑ واپس ہوں اور ان سے گوسالہ پرستی کے متعلق سوال کریں۔ لہٰذا ہارونؑ کو خوف ہوا کہ یہ تفرقہ کہیں ان کی طرف منسوب نہ ہو جائے۔

موسیٰؑ بہ نسبت ہارونؑ کے حقیقتِ نفس الامری (یعنی بات کی اصل) سے زیادہ واقف تھے۔ موسیٰؑ جانتے تھے کہ گوسالہ پرستوں نے حقیقت میں کس کی پرستش کی ہے {نیز اس میں انھوں نے کیا غلطی کی ہے}۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا حکم ازلی ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ خدا جس شئے کا حکم دیتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ لہٰذا موسیٰؑ کا عتاب اپنے بھائی ہارونؑ پر اس لیے تھا کہ ان سے انکار واقع ہوا تھا۔ ان کے قلب میں اتنی وسعت نہ تھی جتنی موسیٰؑ کے قلب میں تھی۔ کیوں کہ عارفِ کامل تو وہ ہے جو ہر شئے میں حق کو دیکھے، بلکہ اُس کو ہر شئے کا عین دیکھے۔ موسیٰؑ، ہارونؑ کی علمی تربیت فرما رہے تھے، اگرچہ (وہ) عمر میں اُن سے چھوٹے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہارونؑ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا تو سامری کی طرف مڑے۔ پھر اس سے فرمایا، فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ، (یعنی) او سامری! تیرا یہ کیا معاملہ ہے، (طٰہٰ:۹۵)۔ تو نے یہ کیا کیا، ایک خاص صورت گوسالہ کی کیوں اختیار کی۔۔؟ قوم کے زیوروں سے یہ کالبد (یعنی اس بُت کو تو نے) کیوں بنایا۔۔؟ ان کے اموال لے کر ان کے دل بھی لے لیے! موسیٰؑ، بنی اسرائیل سے فرماتے ہیں، اے بنی اسرائیل! انسان کا دل وہاں رہتا ہے جہاں اس کا مال رہتا ہے، تم مال آسمان میں رکھو تو تمھارا دل بھی آسمان میں رہے گا۔ مال کو مال اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دلوں کا میلان اسی کی طرف رہتا ہے۔ (تم) سب کے دل میں مال پرستی بھری ہوئی ہے۔ (تم) لوگوں کے دلوں کا مقصودِ اعظم مال ہی ہے۔ اس لیے کہ سب کو اس کی حاجت ہے۔ {سب لوگ مال کو قاضی الحاجات (ضروریات کا پورا کرنے والا)، کافی المہمات (مشکلات کا ساتھی) اور ستار العیوب (گناہوں کو ڈھانکنے والا) سمجھتے ہیں}۔ صورتوں کو بقا و دوام کب ہے۔ موسیٰؑ نے جلا دینے میں جلدی کی۔ ورنہ گوسالہ کی صورت تو جانے والی ہی تھی۔ موسیٰؑ پر غیرت نے غلبہ کیا۔ اسے جلا دیا۔ پھر اس کی راکھ دریا میں بہا دی۔ اور سامری سے فرمایا، وَانظُرْ إِلَىٰ إِلَـٰهِكَ، (یعنی) اور دیکھ اپنے اس معبود کو، (طٰہٰ:۹۷)۔ تعلیم پر متنبہ کرنے کے لیے "الٰہ" فرمایا۔ حالاں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ جلوہ گاہِ الوہیت میں سے ایک جلوہ گاہ ہے۔ (لہٰذا موسیٰؑ نے کہا)، لَّنُحَرِّقَنَّهُ، (یعنی) میں اس کو جلا دوں گا، (طٰہٰ:۹۷)۔

حیوانیتِ انسان کو حیوانیتِ حیوان میں قوتِ تصرف ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے حیوان کو انسان کا مسخر و تحتِ تصرف کر دیا ہے۔ خصوصاً جب کہ اس کی اصل حیوان نہیں بلکہ جمادات ہے، تو زیادہ قابلِ تسخیر

و تصرف ہے۔ اس لیے کہ غیر حیوان کو ارادہ نہیں۔ وہ اُس شخص کے تحتِ تصرف ہے جو صاحبِ ارادہ و تصرف ہے۔ وہ ہرگز اِبا (یعنی انکار) و سرتابی نہیں کر سکتا۔ حیوان تو صاحبِ ارادہ و غرض ہوتا ہے۔ کبھی حیوان سرتابی و انکار بھی کرتا ہے۔ اس میں قوت اظہارِ انکار ہوتی ہے تو انسان کے ارادے کے خلاف سرکشی بھی کرتا ہے۔ قوت اظہارِ انکار نہ رکھتا ہو یا خود حیوان کی غرض بھی اس سے متعلق ہو تو رام ہو کر اطاعت اختیار کرتا ہے۔ یہی حال انسان کا بھی ہے کہ اپنے سے اعلیٰ کی اطاعت کرتا ہے، جب کہ اس سے مال ملنے کی امید ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا، (یعنی) ہم نے بعض کو بعض پر کئی درجے بلند کیا تاکہ بعض بعض کو مطیع و مسخّر بنالے، (الزخرف:۳۲)۔ محکوم اپنے جیسے سے مسخّر ہوتا ہے تو بلحاظ حیوانیت کے مسخر ہوتا ہے، نہ کہ بلحاظ انسانیت کے۔ کیوں کہ مثلین تو ضدین ہوتے ہیں۔ جس کا مرتبہ اعلیٰ و ارفع ہو، مال میں اور جاہ میں (یعنی رتبے یا شان و شوکت میں تو) انسانیت کی وجہ سے وہ تسخیر کرلیتا ہے۔ حاکم ہو جاتا ہے، اور دوسرا مسخّر اور رام ہو جاتا ہے خوف یا لالچ کی وجہ سے، تو براہِ حیوانیت رام ہوتا ہے، نہ کہ انسانیت کی راہ سے۔ پس مثل، مثل کا (یعنی ہم پلہ ایک دوسرے کا) مطیع نہیں ہوتا۔

دیکھو! جانوروں میں کیسی لڑائی رہتی ہے۔ کیوں کہ برابر والے اور مثل رہتے ہیں، (گویا) مثلان، ضدّان ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ، (یعنی) ہم نے تمھارے بعض کے مرتبے بعض سے اعلیٰ و ارفع بنائے ہیں، (الانعام:۱۶۵)۔ پس وہ باہم، ہم مرتبہ نہیں ہیں۔۔۔ لہٰذا درجات کی وجہ سے تسخیر و حکومت ہوتی ہے۔

تسخیر کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ تسخیرِ مراد: یعنی مسخر تسخیر و تصرف کرنے والے کا دوسرے کو اپنے تحتِ ارادہ کرلینا، اگرچہ انسانیت میں بظاہر اپنا مثل ہو۔ جیسے آقا کا اپنے غلام کو مسخّر کرلینا۔ سلطان کا رعایا کو زیر فرمان کرلینا۔ اگرچہ انسانیت میں مثل ہیں۔ آقا و سلطان کا مسخر کرلینا رفعتِ درجہ کی وجہ سے ہے

۲۔ تسخیرِ حال: جیسے رعایا کا بادشاہ کو جو ان کے امور کا ذمہ دار ہے مسخّر کرلینا کہ ان سے مدافعت کرے۔ ان کی حمایت کرے۔ جو رعایا سے عداوت کرے ان سے جنگ کرے۔ ان کی جان و مال کی حفاظت کرے۔ یہ سب رعایا کی تسخیرِ حالی ہے۔ گو وہ منہ سے کچھ نہ کہیں۔ اس طرح رعایا، بادشاہ کو مسخر کرلیتی ہے۔ غور کر کے دیکھو تو یہ بھی یعنی تسخیرِ حال بھی، تسخیرِ مرتبہ ہی ہے۔ رعایا کے مرتبے کا تقاضا ہے اور اس کا یہی حکم ہے۔

بعض بادشاہ خود غرض ہوتے ہیں۔ صرف اپنے لیے کام کرتے ہیں۔ بعض بادشاہ حقیقتِ امر سے واقف ہوتے ہیں۔ ان کے حقوق کا لحاظ رکھتے ہیں اور ان کی قدر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اتنا اجر و ثواب عطا کرتا ہے

جتنا حقیقت شناس علما کو عطا کرتا ہے۔ ان کا اجر صرف اللہ کے ذمے ہوتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام کاروبار کا متکفّل ہے، (کفالت کرتا ہے)۔ عالم بھی حال کی وجہ سے اس ذاتِ پاک کو اپنے حسبِ حال کرلیتا اور مسخّر کرلیتا ہے جس پر لفظ تسخیر کا اطلاق نہیں ہوتا۔ نہ کوئی اس کے متعلق یہ لفظ زبان پر لا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ، (یعنی) ہر وقت وہ ایک نئی شان میں ہے، (الرحمٰن:۲۹)۔

ہارون علیہ السلام نے ہر چند گوسالہ پرستوں کو زبان سے منع فرمایا مگر قہر و غلبہ اور فعل سے اس لیے منع نہ کر سکے، جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کیا، کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا ایک راز، ایک تماشا تھا جو وجودِ خارجی میں ظاہر ہوا کہ (جو) عبادت ہو رہی تھی (وہ) ہر صورت میں زائل و باطل ہونے والی تھی۔ پوجنے والے، نادانی ہی سے سہی، مگر معبود سمجھ کر پوج تو رہے تھے۔ آخر باقی باقی رہے گا اور فانی فنا ہو کر رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انواع میں سے کوئی نوع ایسی نہ رہی کہ اس کی پرستش نہ کی گئی ہو، خواہ معبود سمجھ کر خواہ حاکم سمجھ کر۔ کوئی سنگ پرست (یعنی پتھر کی پوجا کرتا) ہے، تو کوئی زر پرست (یعنی مال کی پرستش کرتا) ہے۔ کوئی شاہ پرست (یعنی حاکم کی غلامی کرتا) ہے (تو) کوئی خود پرست (یعنی اپنے ہی نفس کا غلام) ہے۔ ہر صاحبِ عقل غالب پرستی کرتا ہے۔ کسی شئے کی پوجا نہیں کی جاتی جب تک وہ پوجنے والے کے پاس بلند مرتبہ نہ سمجھی جائے اور اس کے قلب میں اس شئے کا درجۂ عالی نہ مان لیا جائے۔ اسی لیے حق تعالیٰ کے اسما میں سے رفیع الدرجات ہے نہ کہ رفیع الدرجہ۔ پس ایک ہی ذات کے بہت سے درجات ہیں۔ اس نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ ہو۔ وہ بھی مختلف اور کثیر الدرجات ہیں۔ ہر درجے سے ایک تجلّی گاہِ الٰہی پیدا ہوتی ہے جس میں اس کی پرستش ہوتی ہے۔ عظیم ترین جلوہ گاہ جس میں پرستش ہوتی ہے، خواہش و محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَـٰهَهُ هَوَاهُ، (یعنی) کیا تم نے اس کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا، (الجاثیہ:۲۳)۔ خواہش، بزرگ ترین معبود ہے۔ ہر شئے کی اسی وجہ سے پرستش ہوتی ہے۔ اُس کی پرستش بالذات ہے، دوسروں کی بالعرض۔ شیخ (ابن عربیؒ) فرماتے ہیں:

وحق الهویٰ ان الهویٰ سبب الهویٰ ولولا الهویٰ فی القلب ما عبد الهویٰ

قسم ہے محبت کی! محبت کا سبب خود محبت ہے، دل میں محبت نہ ہوتی تو کوئی محبت کی پرستش نہ کرتا

تم دیکھتے ہو (کہ) اللہ تعالیٰ کا علم اشیا کے متعلق کس قدر کامل و اکمل ہے۔ اُس نے اس شخص کے متعلق جس نے خواہشات کی پرستش کی اور ان کو اپنا معبود بنا لیا کیسی پوری بات فرمائی۔ (وہ) فرماتا ہے، وَأَضَلَّهُ اللَّـهُ عَلَىٰ عِلْمٍ، (یعنی) علم رکھتے ہوئے بھی اللہ نے اس کو سرگردان و حیران کر دیا، (الجاثیہ:۲۳)۔ ضلالت کے معنیٰ حیرت کے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ملاحظہ فرماتا ہے کہ اس پرستار نے اپنی خواہش و ہوا، اور جذبۂ شوق اور محبت کی پرستش کی اور اس کے احکام کا مطیع و منقاد ہو گیا۔ جس شخص کو عبادت و بندگی کا حکم محبت نے دیا وہ قبول کرتا ہے، اور اس پر عمل (بھی) کرتا ہے۔ یہ جذبۂ محبت وہ ہے کہ خدا کی عبادت بھی اسی پر مبنی ہے۔ اگر اُس جنابِ مقدس کی محبت اور جذبۂ شوق اور اس کا ارادہ نہ ہوتا تو کوئی نہ اللہ کی عبادت کرتا۔ نہ اس کو دوسروں پر ترجیح دیتا (اور) نہ اس کو اختیار کرتا۔

اسی طرح جو شخص صورِ عالم میں سے کسی صورت کی پرستش کرتا ہے اور اس کو اپنا الٰہ و معبود مانتا ہے تو اس کا اصل سبب، محبت و شوق ہی ہے۔ عابد و پرستار ہمیشہ سلطانِ ہوا (یعنی خواہش) کا تابعدار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ پرستاروں اور پوجنے والوں کے معبودات بھی مختلف طرح پر اور نوع بہ نوع کے ہیں۔ ایک کا پوجنے والا دوسرے کے پوجنے والے کی تکفیر کرتا ہے۔ اس کو خطاکار سمجھتا ہے۔ جو ادنیٰ درجہ کی آگاہی رکھتا ہے وہ حیران و سرگردان رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ جذبۂ محبت کو متحد دیکھتا ہے بلکہ ہر جگہ ایک ہی محبت کو پاتا ہے۔ اس لیے کہ محبت کی حقیقت ہر عابد و پرستار میں ایک ہی ہے۔ جب یہ حالت ہے تو اللہ تعالیٰ عابد کو حیران کر دیتا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ ہر عابد محبت ہی کی پرستش کرتا ہے اور محبت ہی نے اس کو اپنا بندہ بنالیا ہے۔ خواہ محبت و عبادت امر مشروع کی ہو یا نہ ہو۔ جو عارف، کامل مکمل ہوتا ہے وہ ہر شئے کو جلوہ گاہِ حق جانتا ہے۔ ان ہی جلوؤں کا سبب ہے کہ نادانوں نے باوجود اسم خاص کے مثلاً پتھر، درخت، حیوان، انسان، آگ، ستارے (اور) فرشتے کو الٰہ و معبود مانا۔ الوہیت کیا ہے۔؟ عابد کا تخیل ہے کہ فلاں کے لیے مرتبۂ معبودیت ہے۔ حالاں کہ وہ حقیقتاً اس عابدِ خاص کے سامنے، اس کی نظر کے روبرو جو اپنے معبودِ خاص کو پکڑا بیٹھا ہے صرف ایک جلوہ گاہِ الوہیت ہے، نہ (کہ) حقیقی الٰہ۔ یہی وجہ تو ہے کہ بعض نادان لوگوں نے مجلّیٰ و جلوہ گاہ الوہیت اور خود، الوہیت میں تمیز نہ کر کے کہہ دیا، مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّـهِ زُلْفَىٰ، (یعنی) ہم ان بتوں کی عبادت یا پوجا اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو قربِ الٰہی بخشیں، (الزمر:۳)۔ ذریعۂ قرب بھی کہتے ہیں جو غیر مقصود بالذات ہونے پر دال ہے۔ پھر عبادت بھی کہتے ہیں جو الٰہ کے ساتھ خاص ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ ان اصنام (یا بتوں) کے الٰہ ہونے کی تصریح کرتے ہیں اور کہتے ہیں، أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَـٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَـٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ (یعنی) کیا ان ہزاروں خداؤں کو ایک ہی خدا کر دیا ہے، یہ تو بڑی تعجب خیز اور اچنبے کی بات ہے، (ص:۵)۔ وہ توحید سے انکار نہ کر سکے بلکہ تعجب میں سرگرداں رہ گئے۔ وہ تو ہزاروں صورتوں کی طرف نسبتِ الوہیت کر کے کھڑے رہے (اور پھر) اڑے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور ان کو ایک معبود کی طرف دعوت دی جس کو سب جانتے ہیں (جب کہ) کسی کو اس کا شہود نہیں۔ اس پر بیّن شہادت ہے کہ وہ خود اس کو ثابت و حق جانتے ہیں اور اس کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ جو ان کے اس قول سے ظاہر ہے (کہ) مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّـهِ زُلْفَىٰ (یعنی) ہم ان بتوں کی عبادت یا پوجا اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو قربِ الٰہی بخشیں، (الزمر:۳)۔ پھر وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ صور، پتھر ہیں۔ اسی لیے ان پر حجت قائم کی گئی، یہ کہہ کر (کہ) قُلْ سَمُّوهُمْ، (یعنی) تم پوچھو! ذرا ان کے نام تو بتائیں، (الرّعد:۳۳)۔ نام تو وہی بتلائیں گے جن کو وہ جانتے ہیں، کہ ان کی ایک حقیقتِ خاص ہے۔

مگر عارفین، جو حقیقتِ نفس الامری و واقعی سے واقف ہیں، ان صور کی عبادت سے انکار ظاہر کریں گے کیوں کہ ان کے مرتبۂ علم و معرفت اور حکم وقت کا اقتضا ہے کہ حکم رسول کی تابعداری کریں وہ رسول پر ایمان لائے ہیں اسی وجہ سے ان کو مومنین کہتے ہیں۔ لہٰذا عرفا تابعِ وقت رہتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ {ان بتوں کے ضمن میں} یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان نادانوں نے دراصل ان صور و اعیان کی پوجا نہیں کی بلکہ اللہ ہی کی عبادت کی ہے، اور یہ سلطان، تجلی الٰہی کا تقاضا ہے۔ ان تجلیات کو اصنام (یعنی ان بتوں) میں سے عرفا دیکھتے ہیں۔ نادان، جس کو تجلیات کا علم نہیں، انکار کرتا ہے۔ نبی و رسول اور ان کے وارثِ حال جو عارفِ کامل ہیں، نادانوں سے اس حقیقت کو چھپاتے ہیں۔ وارثِ نبی ان متعین صور سے جو زوال پذیر ہیں باز رہنے کا حکم دیتے ہیں، اس لیے کہ رسولِ زمانہ نے ان باطل اشیا کی پوجا سے روکا ہے۔ رسول کی اتباع، محبتِ الٰہی کی امید سے ہے۔ کیوں کہ (اللہ تعالیٰ) فرماتا ہے، إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّـهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّـهُ، (یعنی) اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا، (اٰل عمران:۳۱)۔ رسول اللہ نے ایک الٰہ کی طرف دعوت دی جو سب کا محتاج الیہ اور حاجت روا ہے۔ وہ سب کا معلوم اور سب کا متفق علیہ ہے، مگر اس کی ذاتِ پاک کو شہود میسر نہیں۔ بصارتیں (یعنی ہماری آنکھیں) اس کو ادراک اور احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اس لیے کہ وہ (یعنی حق تعالیٰ) بصارتوں کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ بڑا ہی لطیف ہے۔ اعیانِ اشیا میں ساری ہے (یعنی ہر شئے میں سرایت کیے ہوئے ہے) لہٰذا ابصار اس کو ادراک نہیں کر سکتیں۔ (بالکل ایسے) جس طرح کہ وہ اپنی ارواح کو ادراک نہیں کر سکتے۔ حالاں کہ ارواح، اشباح (یعنی جان) و تن اور صورِ ظاہری کے مدبّر و منتظم ہیں۔ اللہ ہی لطیف و خبیر ہے۔۔۔ خبیر، خبرت سے مشتق ہے (اور) خبرت کے معنیٰ ہیں، ذوق۔۔۔ ذوق، تجلی ہے۔ تجلی، صور میں ہوتی ہے۔ پس صورتوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اور تجلی کا ہونا بھی لابُد ہے (یعنی لازمی ہے)۔ صاحبِ ہوا (یعنی نفسِ امارہ کے خواہشمند لوگوں) کا اس کو دیکھ کر، اس سے متاثر ہو کر، پوجا کر بیٹھنا بھی ہونے والی ہی بات ہے۔

مترجم کہتا ہے (یعنی مولانا عبدالقدیرؒ فرماتے ہیں):

غیر محدود کو محدود سمجھنا، گذشتہ کو پکڑ کر بیٹھے رہ جانا، تازہ تجلیات کی طرف التفات نہ کرنا ظاہر کو ظاہر کا (اور) باطن کو باطن کا حق نہ دینا، متفق علیہ کو چھوڑ کر متفق فیہ کے لیے لڑنا، ظلم ہے۔ کاش تم اس حقیقت کو سمجھتے۔ سیدھا راستہ دکھانا اللہ ہی کا کام ہے۔ اور اُسی سے اس کی امید ہے۔